منشی احمد دینؒ

شاہ جی کی کہانی

مضمون نویسی میرا کام نہیں اور نہ اس کی مجھ میں صلاحیت ہے۔ ایسی حالت میں سید عطاءاللہ شاہ بخاری ایسے مجاہد کامل کی زندگی کے حالات پر قلم اٹھانا اپنی حیثیت اور قابلیت سے زیادہ ابھرنے کے مانند ہے یہ مضمون اگر شرمندۂ اشاعت ہوا تو ہزاروں لوگوں کی نظر سے گزرے گا مضمون میں کہاں غلطی ہے اور کہاں نہیں اس پر بھی نظر جائے گی۔ ایسی حالت میں شاہ جی کے پردے میں اپنا چہرہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا زیب نہیں دیتا۔

تاہم جرأت کر رہا ہوں، شورش بھائی کا حکم ہے اور فرض کی ادائیگی بھی ضروری ہے علاوہ بریں مجھے اپنے ایک دوست راہبر اور بزرگ کو اپنی عقیدت کے پھول بھیجنے ہیں۔

شاہ جی زندہ تھے تو ان سے آزادی کے بعد ملاقات کا امکان خارج از خیال تھا۔ کبھی کبھار زبانی سلام و پیام ہو جاتا لیکن جس دن سے ان کی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعے آنکھوں کے سامنے آئی ہے وہ مجھے بھولتے نہیں۔ "روز آتے ہیں میرے دل کو تسلی دینے"

ابتدائی زمانہ

سال تو مجھے یاد نہیں رہا۔ البتہ ۱۹۱۹ء سے کئی سال قبل کا زمانہ تھا جب میری نظروں کے سامنے ان کی نورانی تصویر آنے لگی۔ گو میری عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ گھر سے کام پر جانے کے لئے میرا ایک راستہ تھا۔ دوپہر کے بعد اکثر اس راستہ میں ان کا اور میرا گزر آمنے سامنے سے ہوتا۔ میری ان سے کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ میں ان کے نام ہی سے واقف تھا۔ اس زمانے کے سید عطاءاللہ شاہ کی قلمی تصویر جو آج بھی میرے سامنے ہے کچھ اس طرح سے بیان کر سکتا ہوں۔

پانچ فٹ چھ انچ کا ایک دبلا سا مگر مضبوط نوجوان، رنگ گندمی چہرہ کشادہ اور چمک دار آنکھیں بڑی بڑی مگر چمکیلی، ناک سیدھی مگر مناسب، پیشانی کشادہ معمولی چھوٹی چھوٹی داڑھی جو سُرخ و سفید چہرے پر پیاری معلوم ہوتی تھی۔ زلفیں شانوں تک تیل میں بسی ہوئیں تیل کے نشان ان کی شیروانی کے کندھوں پر اکثر ہوتے۔ یہ نوجوان بازاروں سے گزرتا ہوا لوگوں کی نظروں کو ضرور کھینچتا چلا جاتا تھا۔ چونکہ شاہ جی حافظ قرآن تھے اس لئے اکثر لوگ ان کو حافظ جی کہتے تھے۔

شاہ جی مولانا غلام مصطفی صاحب مرحوم کے مدرسہ دینیات میں بغرض تعلیم جاتے اور مولانا مفتی عبدالصمد صاحب مرحوم سے سبق پڑھتے۔ اس زمانے میں شاہ جی کبھی کبھی بعد از نماز جمعہ مسجد میاں جان محمد میں وعظ فرماتے مگر یہ زمانہ ان کی نو آموزی کا تھا۔

قبلہ شاہ جی کے خاندان کے لوگ اور بزرگ زیادہ تر امرتسر ہی میں رہائش پذیر تھے اور کاروباری زندگی میں

مصروف تھے۔ شاہ جی کا اپنے رشتہ داروں سے بہت اچھا تعلق تھا ان میں سے اکثر سے میری ملاقات تھی۔ حضرت شاہ جی کے والد بزرگوار حافظ سید ضیاءالدین رحمہ اللہ موضع ناگڑیاں ضلع گجرات میں قیام پذیر تھے۔ کبھی کبھی شاہ جی والد صاحب کی خدمت میں حاضری کے لئے جاتے تھے۔

قومی زندگی کا آغاز

۱۹۱۹ء کے فوراً بعد جب امرتسر کے لوگ مارشل لاء اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ جانکاہ سے بُری طرح نڈھال تھے۔ یکایک لفظ خلافت سننے میں آیا۔ اس وقت مولانا محمد داؤد اور غزنوی پہلے بزرگ تھے جو میدان میں نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کو مسئلہ خلافت سمجھانا شروع کیا ساتھ ساتھ دولت عثمانیہ ترکی کے خاتمہ کا ماتم بھی تھا۔ یہ زمانہ عالم اسلام پر چاروں طرف سے مصیبتوں اور آفتوں کا زمانہ تھا۔ جزیرۃ العرب اور دیگر مقامات مقدسہ غیروں کے قبضہ میں تھے۔ جب اس اجمال کی تفصیل مسلمانوں کو سنائی جانے لگی تو مسلمان عوام کے اندر صدمہ اور جوش کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

حضرت شاہ جی اس وقت صرف مذہبی وعظ فرماتے تھے وہ مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ شریک نہ ہوئے البتہ کبھی کبھی مولانا غزنوی کے نظریہ پر شاہ جی مخالفانہ انداز بھی اختیار کر لیتے۔ مجھے شاہ جی نے بتایا کہ ایک بار مولانا داؤد غزنوی نے خود کوشش کر کے مجھ سے ملاقات کی اور کئی گھنٹوں کی ملاقات میں موجودہ مسئلہ کو کھول کر بیان کیا۔ تب شاہ جی قائل ہو گئے پھر کیا تھا پھر تو امرتسر کے مسلمانوں کی کایا ہی پلٹ گئی۔ شاہ جی کا عہد جوانی اور ساتھ ساتھ جوش ایمان اور قوت بیان ایک آگ لگ گئی۔

میرے لئے سیاسی جلسوں میں شمولیت کا پہلا موقع تھا۔ مسئلہ خلافت اور انگریز حکومت کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کے دلوں کے زخموں پر نمک کا کام دیتی تھیں۔ امرتسر ابھی ابھی زخم کھا کر نکلا تھا مگر مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریروں اور مذہبی وعظوں نے ہندو مسلمان سب کے اندر بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ اتنے میں ۱۹۱۹ء کا دسمبر آ گیا اور کانگریس کا سالانہ جلسہ زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو امرتسر میں منعقد ہوا، ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھی حکیم اجمل خان صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

یہ دسمبر امرتسر کے لئے تو بارانِ رحمت ثابت ہوا کہ ہندوستان کے تمام لیڈر امرتسر پہنچ گئے جو جیلوں میں تھے وہ رہا کر دیئے گئے۔ علی برادران بھی جیل سے رہا ہو کر سیدھے امرتسر وارد ہوئے یہ زمانہ علی برادران کے عروج کا زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مولانا محمد علی نے حالات حاضرہ اور عالم اسلام کی تباہی و بربادی پر تقریر کی۔ اس جلسہ میں شاہ جی نے تقریر فرمائی اور دس لاکھ روپیہ چندہ کے لئے اپیل کی جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور روپیہ کی فراہمی شروع ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خان اس جلسہ میں موجود تھے مگر حکومت کی طرف سے ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ زمانہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان پر انگریزوں کے انتہائی عتاب کا تھا۔ مگر اسی اجتماع میں ان کو تار ملا کہ مولانا کی زبان بندی ختم کر دی گئی ہے۔ تب امرتسر کا یہ قومی ہفتہ پوری شان سے منایا گیا۔ یہیں شاہ جی کا گہرا تعلق علی برادران سے ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا دورہ پنجاب ہوا۔ یہ دورہ زیادہ تر مذہبی تھا اور مولانا مسلمانوں سے بیعت جہاد لے رہے تھے۔ لاہور کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد رانا فیروزالدین نے جو اس وقت خلافت کمیٹی پنجاب کے سیکرٹری جنرل تھے، اعلان کیا کہ جو مسلمان مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے اس مجمع کے آخر میں شاہ جی حوض کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہی مولانا عبدالقادر صاحب قصوری بھی تھے۔ شاہ جی نے سنا تو سخت بے چین ہوئے۔ مولانا عبدالقادر صاحب سے کہا کہ دیکھو سب کام خراب ہورہا ہے یہ کہہ کر شاہ جی نے ایک چھلانگ لگائی اور لوگوں کے گویا سروں سے گزرتے ہوئے منبر تک پہنچ گئے۔ صدر خاموش تھا ان سے کہا کہ میں ان کے اس اعلان کی وضاحت کروں گا۔

مولانا عبداللہ قصوری خاموش رہے۔ شاہ جی نے اپنی خداداد قرأت و بلند آواز سے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کرلیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ مولانا آزاد بھی محو حیرت شاہ جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ جی نے اس عظیم الشان مجمع کو چند منٹوں کے اندر اندر اپنی گرفت میں لے لیا اور اس نقطہ کی وضاحت فرمائی کہ جو لوگ پہلے کسی مرشد سے بیعت ہیں ان کی اس بیعت سے اثر نہیں پڑتا وہ بیعت ارشاد تھی اور یہ بیعت جہاد ہے"۔

اتنا کہہ کر اپنے ہاتھ مولانا آزاد کے ہاتھوں میں دے دیئے اور کلمات بیعت کا ورد شروع کیا۔ شاہ جی پہلے پڑھتے پھر تمام مجمع پڑھتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تمام درو دیوار سے یہ ہی آواز آرہی ہے اور خشوع و خضوع کا یہ عالم تھا کہاس وقت بلاشبہ قرن اول کا یہ واقعہ یاد آگیا جب حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مدینہ منورہ میں انصار سے بیعت لی تھی۔ ایسا منظر پھر زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اس واقعہ کے بعد شاہ جی کا تعلق مولانا آزاد سے ہوگیا۔ (مولانا آزاد نے اسی موقع پر فرمایا تھا۔ میرے بھائی! آپ کی اس خدمت پر ملک و ملت کا ہر گوشہ شکر گزار ہے)

علی برادران امرتسر میں رہا ہو کر پہلی بار آئے تو اس وقت ان کا نعرہ مسلمانوں کے لئے ایک ہی تھا ہجرت یا جہاد کیونکہ مسلمانان عالم پر ایسا تاریک دور تھا کہ انہیں کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔ برطانیہ پہلی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد اتنا مغرور تھا کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ برطانیہ کے وزیر اعظم جنگ عظیم کا فاتح یہودی تھا۔ اس نے قیصر کی حکومت کو تو پاش پاش کیا ہی تھا مگر عرب کے بھی کئی ٹکڑے کر کے رکھ دیئے۔ اس کے علاوہ ایشیاء اور افریقہ کا کوئی آزاد ہو۔ ایران، افغانستان، عرب، مراکش، الجزائر، مصر تمام بلاد اسلامیہ برطانیہ یا اس کے اتحادیوں کے زیر تصرف تھے۔ فلسطین پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو فاتح فوجی افسر کے سینے پر تمغہ آویزاں کرتے ہوئے برطانیہ کے یہودی وزیر اعظم نے کہا تھا کہ " یہ آدمی صلیبی جنگ کا فاتح ہے اس نے فلسطین کو فتح کیا ہے"۔

حالانکہ دوران جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ فتح کی صورت میں عرب اور مقامات مقدسہ آزاد رہیں گے اور یہ جنگ مذہبی نہیں ہے سیاسی ہے۔ لیکن وہ وعدہ ہی کیا جس کو انگریزوں نے پورا کیا ہو۔

ایک وعدہ برطانیہ نے شریف حسین حاکم مکہ سے کیا تھا کہ خاتمہ جنگ پر شریف حسین کو وحدت

عرب کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ یہ دونوں وعدے اپنی جگہ پر اور برطانیہ کے دھوکہ اور فریب کی تاریخ اپنی جگہ پر۔

انگریزوں اور امریکنوں نے مل کر فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانا شروع کیا جس کی داستان علیحدہ کتاب کی محتاج ہے۔ اور آج وہ وطن موجود ہے جو تمام عرب کے لئے ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ مذکورہ بالا سوالوں پر حضرت شاہ جی کی پوری نظر تھی۔ جب وہ اپنی طویل تقریر میں وجد کے عالم میں آتے تھے تو ان آنے والے تاریخی واقعات کا اشارہ بھی فرماتے تھے۔

ہجرت

حضرت شاہ جی کی زندگی کے حالات مختصر ہی کیوں نہ بیان ہوں گے مگر وہ نامکمل اور سراسر نامکمل اگر تحریک ہجرت کا ذکر ان کے ساتھ نہ کیا جائے کیونکہ اس تحریک کے روح رواں شاہ جی ہی تھے۔ گو اس قافلہ کے ہر اول جناب عزیز ہندی تھے جنھوں نے پہلے پہل اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس بات کی تفصیل آج میں کافی حد تک بیان کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ جو حقیقت حال پر مبنی ہوگی۔ میرے بعد اب کوئی دوسرا آدمی زندہ بھی نہیں جو اس تحریک کے بنیادی پہلو پر روشنی ڈال سکے۔

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد ہمیشہ سے ہندوستان کے انقلاب کی پناہ گاہ رہی ہے۔ اور افغانستان میں جب غازی امان اللہ خان برسر اقتدار آئے تو آزاد ہند کے راہنماؤں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ کیونکہ امان اللہ خان آزادیٔ ہند کے حامی تھے۔ مگر ان کی مجبوری تھی کہ ان کے والد کے زمانہ ہی سے شاہ افغانستان انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ عملاً برطانوی سفیر مقیم کابل کی حکومت افغانستان میں تھی۔ بادشاہ برائے نام ہی تھا۔ امان اللہ نے آتے ہی پہلا حملہ جب انگریزی سرحد پر کیا تو اس وقت انگریزی فوج بہت کم تھی پنجاب میں شورش ہونے کی وجہ سے مارشل لاء نافذ تھا اور فوج پنجاب میں تھی۔ حکومت ہند کے لئے یہ وقت بڑا مشکل تھا اس افغانی حملہ کی وجہ سے ایک تو عملاً مارشل لاء اٹھ گیا۔ دوسرے پنجاب کی شورش کے باعث انگریزوں کو امان اللہ سے عارضی صلح کرنا پڑی۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو انگریزوں کا پنجاب کو پریشان کرنے کا فیصلہ ابھی بہت باقی تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہندوستان کو یہ بھی ہوا کہ حکومت برطانیہ کی پالیسی ہندوستان کی طرف عارضی طور پر کچھ نرم پڑ گئی۔

ان تمام حالات کے باوجود ۱۹۲۰ء کا ہندوستان سخت آزمائش سے گزر رہا تھا۔ اس کو کوئی راستہ نہ ملتا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ یہی وہ دور ہے جب ہجرت کی تحریک یکایک شروع ہوگئی۔ اور اس کا اثر مسلمانوں پر بے پناہ ہوا۔ حضرت شاہ جی نے کافی غور و فکر کے بعد اس میں ہاتھ ڈالا کیونکہ حکومت افغانستان نے اپنی طرف سے ہجرت کرنے والوں کو بلایا۔ اس سے امید کی یہ کرن پیدا ہوئی کہ شاید حکومت پر کچھ دباؤ پڑ جائے اور وہ مسلمانان ہند کے مطالبات پر توجہ دے سکے۔ اب شاہ جی نے ہجرت کی تحریک میں جان ڈالنی شروع کی۔ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے اندر تو یہ قابو سے باہر ہوگئی اور حکومت انگریزی سخت گھبراہٹ میں پڑ گئی۔ سپیشل گاڑیاں بھی چلنی شروع ہوگئیں۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر ہملٹن گرانٹ نے تو ایک

قافلہ کو ہاتھ جوڑ کر روکنے کی کوشش کی مگر مسلمان سر بکف جارہا اور اپنی لاکھوں کی جائیداد کو چھوڑ کر بے وطن ہو رہا تھا۔ جب یہ تحریک زوروں پر تھی تب سرکار انگریزی کی مشنری حرکت میں آئی اور سینکڑوں کی تعداد میں انگریز کے ایجنٹ مسلمان، ان قافلوں میں شامل ہوگئے تاکہ انتشار پیدا کرسکیں۔

حکومت افغانستان نے اپنی بساط کے مطابق مہاجروں کا استقبال کیا اور ان کو جاتے ہی زمین وغیرہ دے دی کہ یہ اپنی روزی وغیرہ کا کچھ بندوبست کریں۔ مگر انتشار پسندوں نے پہلے دن سے ہی مہاجرین کے اندر بددلی پیدا کرنی شروع کر دی۔ حالانکہ راستہ میں غیر علاقہ کے افغانوں نے اپنے اسلامی جذبہ کا بڑھ چڑھ کر ثبوت دیا۔

اسی دوران میں ہندوستان کی تحریک خلافت کے رہنما مولانا شوکت علی نے شاہ امان اللہ خان کو ایک زبانی پیغام بھیجا۔ یہ پیغام لے جانے والا آدمی ابھی تک زندہ ہے جس نے شاہ امان اللہ کو یہ پیغام دے کر اس کا ردعمل معلوم کرنے کی کوشش کی جو خاموشی کی صورت میں ملا مولانا شوکت علی نے شاہ کو یہ پیغام دیا کہ!۔

"آدمی، روپیہ سب طرح سے ہم انگریز کے خلاف تمہاری مدد کریں گے۔ مگر ہندوستان کی زمین کا ایک انچ بھی نہیں دیں گے" یہ پیغام سن کر امان اللہ خان دم بخود رہ گئے۔

دوسری طرف انگریز نے افغانستان کی خود مختاری مان لی جس کے لئے کابل کی حکومت کو اشارہ مل گیا کہ حکومت ہند سے تعلقات بہتر کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ مہاجرین کو ہندوستان واپس بھیج دو۔ ان دونوں باتوں نے حکومت کابل کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اس نے مہاجرین کی طرف جو دست شفقت دراز کیا تھا وہ واپس لے لیا۔ تب مہاجروں کے لاکھوں کے اجتماع کے اندر پریشانی اور انتشار شروع ہوا۔ پھر وہ طبقہ بھی مہاجرین کے اندر ہی تھا۔ جو اپنے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اس طرح یہ تحریک ہجرت ناکام ہوئی مگر افغانستان آزاد ہو گیا۔

اس ناکامی کے ساتھ ہی مہاجرین کے قافلے واپس آنے شروع ہوئے اور افغان سرکار کا شکوہ شروع ہو گیا۔ بات بھی یہی تھی کہ افغانستان والوں نے جس طرح دعوت دی تھی پھر ویسا سلوک نہیں کیا۔ وہ بھی مجبور تھے۔ ان کی سیاست اس کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس تحریک کا اثر شاہ جی کی طبیعت پر بھی ہوا۔ انہوں نے اپنا قیام امرتسر کی بجائے گجرات پنجاب میں تبدیل کر لیا۔

تحریک عدم تعاون اور قومی تعلیم

حضرت شاہ جی شروع میں تو عدم تشدد اور عدم تعاون کے قائل نہیں تھے بلکہ اسکے خلاف ان کی کئی ایک تقریریں میں نے سنی ہیں۔ لیکن اگست ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا سپیشل اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ جہاں گاندھی جی نے اپنا لائحہ عمل کانگریس کے سامنے رکھا۔ اس کام میں گاندھی جی تن تنہا تھے۔ صرف مولانا آزاد ان کے ساتھ تھے۔ جن کے ساتھ گاندھی جی کی نئی نئی ملاقات ہوئی تھی۔ عوامی ایجی ٹیشن کے لئے شوکت علی ان کے ساتھ تھے باقی سب لیڈر خلاف تھے۔ اس اجلاس کے صدر لالہ جپت رائے بھی اس پروگرام کے خلاف

تھے۔ شاہ جی اسی اجتماع میں مولانا آزاد کی تقریر سے متاثر ہو کر اس پروگرام کے حق میں ہوگئے۔ جب کلکتہ سے لوٹے تو وہ ایک نئے سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے۔ شاہ جی میں انگریز دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی ڈپلومیسی اور اس کی تلوار نے تمام مسلمانان عالم کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ شاہ جی یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اگر ہندوستان انگریز کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے تو عالم اسلام کی غلامی کی زنجیریں سب ٹوٹ کر گر جائیں گی لیکن ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلمان کا اتحاد بنیادی بات ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو سب کام بیکار ہیں چنانچہ کانگرس کی رہنمائی میں ترک تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا۔ جمعیت العلماء ہند نے پولیس اور فوج کی نوکری کے حرام ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ وکیل وکالت کا پیشہ چھوڑ دیں۔ اسکول اور کالج کی طالب علمی چھوڑ دیں۔ اس فقرے پر اب سارے ملک میں کام ہونے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم اپنی تعلیم ترک کر کے درسگاہوں سے باہر آگئے۔ تب نیشنل تعلیم کے لئے مختلف کالج اور سکول قائم ہوئے جس میں قومی تعلیم شروع ہوئی۔ جس کا مقصد تھا آزادی کی جنگ کے لئے سپاہی اور لیڈر پیدا کرنا۔

حضرت شاہ جی نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی جیسی ان کی طبیعت تھی ویسا ہی کام ہوا۔ ایک طوفان اٹھا اور گجرات جیسے ضلع سے جو سب سے زیادہ رجعت پرست مانا گیا ہے ایک لاکھ روپیہ سکول کے لئے جمع ہو گیا۔ عمارت تیار ہو گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں طالب علم حصول علم کے لئے اس سکول میں داخل ہوئے۔ مولانا آزاد خاص کر اسی سکول کی وجہ سے گجرات تشریف لے گئے اور اہل گجرات نے ان کا شاندار استقبال کیا۔

ایک لطیفہ

ویسے تو شاہ جی رونق محفل تھے ہی۔ خلوت ہو یا جلوت، سکہ انہیں کا چلتا تھا۔ مگر قدرت نے مجمع عام میں فتح کا سہرا انہی کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ آزاد ہائی سکول کا چندہ کرتے کرتے شاہ جی کا دورہ وزیر آباد کے شہر میں ہوا۔ جو گجرات کا ہی حصہ ہے۔ مگر وزیر آباد کے شاطروں نے شروع سے ہی طے کر رکھا تھا کہ اس شہر میں کسی کا قدم نہ جمنے پائے۔ خواہ وہ کتنا ہی نیک مقصد لے کر ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اس سازش میں سبھی انگریز پرست شامل تھے جب پہلی بار گاندھی جی بھی اس شہر میں وارد ہوئے (حالانکہ وہ صرف پنجاب پر کئے گئے مظالم کی تحقیقات کے لئے گئے تھے) تو کسی نے بھی ان کو اپنے گھر پر ٹھہرانے کی جرأت نہ کی تھی۔ وزیر آبادی مسلمان کا تو یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی مہمان قومی یا مذہبی کام کے لئے باہر سے آیا ہے تو اس کی خوب خاطر تواضع کرتا اور جب پبلک جلسہ ہو یا مسجد کے اندر نماز جمعہ کا خطبہ ہو تو عین اسی حالت میں آپس میں دست و گریبان ہو جاتا۔ مگر مہمان کو کوئی گزند نہ پہنچتا۔ لیکن اس طرح جلسہ کے امن کو برباد کر دیتا۔ حضرت شاہ جی وزیر آباد تشریف لے گئے اور نماز جمعہ کے لئے شاہ جی سے درخواست کی گئی کہ آپ ہی پڑھائیں۔ شاہ جی کو اس شہر کے لوگوں کا کردار معلوم تھا۔ مگر انہوں نے قبول کر لیا اور خطبہ کے ابتدائی حصہ میں ہی مسلمانوں کو اتنا

گرما دیا کہ سوائے شاہ جی کی بات سننے کے کسی کا اور کسی طرف خیال نہ گیا۔ شاہ جی نے نماز سے قبل ہی چندہ کر لیا اور روپیہ قابو کر کے اپنے ایک آدمی کے سپرد کر دیا کہ وہ لے کر گجرات چلا جائے تب نماز جمعہ ادا ہوئی۔ نماز کے بعد جب ان شیطانوں کو پتہ چلا کہ روپیہ بھی باہر جا چکا ہے تو وہ آکر شاہ جی کے پاؤں پر گر گئے کہ ہم ہارے اور آپ جیتے یہ قصہ شاہ جی کی زبانی میں نے سنا تھا۔

ابھی آزاد ہائی سکول کا کام زوروں پر تھا اور شاہ جی دن رات اسی میں مصروف تھے کہ امرتسر تشریف لے گئے ان کی ہمشیرہ کی شادی تھی۔ وہ ان کی تیاری کے لئے آئے تھے۔ امرتسر کے لوگوں نے نماز جمعہ کے بعد حضرت شاہ جی کا وعظ مسجد خیر الدین مرحوم میں رکھا یہ وعظ ان کی گرفتاری اور تین سال قید کا باعث ہوا۔ (۱) اس تقریر کا موضوع تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی ٹکر۔ جس میں آخری شکست فرعون کی ہوئی۔ شاہ جی نے آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا انجام انگریز حکومت کی موت اور اہل ہند کی فتح پر ختم کیا۔ شاہ جی کا طرز بیان اور پھر مضمون کی دلچسپی نے اہل امرتسر کو مبہوت کر دیا۔ اس کا اثر حکومت نے بھی لیا دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ چلا کر تین سال قید سخت کی سزا دی۔ غالباً یہ پنجاب کا دوسرا مقدمہ تھا۔ اس سے قبل پانی پت کا مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ تحریک آزادی کی آزمائش کا زمانہ تھا کہ جو بھی گرفتار ہو وہ مقدمہ میں نہ تو صفائی پیش کرے اور نہ وکیل کرے۔ صرف ایک بیان دے کر عدالت کا فیصلہ سن لے۔ اس وقت یہ بہت اہم بات تھی۔ اور شاہ جی کے لئے بھی یہ روز اول ہی تھا۔ مگر شاہ جی نے بیان میں چند آیات قرآنی تلاوت فرما کر بیان ختم کر دیا۔ اس کا اثر عدالت کے کمرہ میں ایسا ہوا جیسا ماحول ہی بدل گیا ہو۔ سزا کے بعد شاہ جی لاہور سنٹرل جیل میں پہنچا دیئے گئے جہاں کچھ نئے پولیٹکل قیدی پہلے سے موجود تھے۔ اس زمانے میں جیل کی خوراک خدا کی پناہ۔ آدمی کھا نہیں سکتا تھا۔ لاہور جیل کا داروغہ پنجاب کا مشہور جابر و ظالم جیلر تھا۔ جس کو نواب بیگ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ جب وہ شخص جیل کے اندر داخل ہوتا تو خدا کو بھول جاتا تھا۔

شاہ جی کا بیان ہے کہ پہلے دن کھانے کی قطار میں بیٹھا تو دو روٹیاں اور دال لوہے کے ایک برتن میں ڈال دی۔ حال یہ تھا کہ اگر دونوں ہاتھ کھول کر وہ روٹی ہاتھوں پر نہ لی جاتی تو زمین پر دو ٹکڑے ہو کر گر جاتی۔ یہ روٹی چنے اور گندم کے آٹے کی ہوتی مگر اس میں آٹے سے زیادہ کچھ اور ہی ہوتا اور کچی رکھی جاتی۔ تاکہ وزن ٹھیک رہے میں نے دال کو دیکھا تو اس میں پانی زیادہ تھا۔ تب میں نے کوشش کی کہ پانی تھوڑا گرا دیا جائے کچھ دال کے دانے نیچے سے مل جائیں گے تو روٹی کھا سکوں گا۔ میں رفتہ رفتہ پانی گراتا گیا اور اس انتظار میں رہا اب دال نظر آتی ہے مگر سب پانی ختم ہو گیا اور دال نہ ملی۔ ادھر جیل کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ کوئی دوسری صورت سامنے نہ تھی نمک مرچ یا کسی دوسری چیز کا ملنا تو کار مشکل تھا۔ اس شام صرف صبر و شکر کے

۱۔ امرتسر میں شاہ جی کی گرفتاری کے بعد مولوی رحمت اللہ بٹالوی (جنہوں نے احرار کے سٹیج سے مرزائیت کے خلاف زبردست کام کیا) حوالات میں شاہ جی سے ملنے گئے تو شاہ جی نے فرمایا: مولوی رحمت اللہ! تم بھی یہاں آجاؤ، تصوف و سلوک کی ساری منزلیں ایک ہی رات میں طے ہو گئی ہیں۔ (مدیر)

ساتھ صبح کرنی پڑی۔ اس کے بعد یہ قافلہ کچھ ماہ بعد پنجاب کے سرحدی ضلع میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

میانوالی ڈسٹرکٹ جیل

گاہ گاہ آراستہ ہوتے ہیں جلسے عیش کے
آنسوؤں کے ساتھ برسوں یاد آنے کے لئے

میانوالی جیل میں ایک کے بعد دوسرا بزرگ آزادی کی راہ اختیار کرتا ہوا پہنچتا رہا۔ اور یہ قید اہل علم و دانش کی اور سیاسی مفکروں کی مجلس بن گئی۔

گاندھی جی نے سول نافرمانی انفرادی طور پر شروع کی۔ میانوالی جیل میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عبدالمجید سالک، مولوی اختر علی خاں صاحب، صوفی اقبال احمد انصاری پانی پتی، مولانا لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، عبدالعزیز انصاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ان کے علاوہ مشہور کانگرسی بزرگ مولانا عبداللہ چوڑی والے۔ لالہ شنکر لال، دینش بندھو گپتا وغیرہ لوگ تھے۔ باقی والنٹیر کوئی ڈیڑھ سو کے قریب تھے۔ میں بھی ایک رضا کار کی حیثیت سے سزایاب ہوا اور امرتسر سے میانوالی جیل میں ایک گروہ کے ساتھ پابجولاں بھیج دیا گیا۔ کچھ دن بعد میری پہلی ملاقات جناب شاہ جی سے ہوئی یہ ۱۹۲۲ء کے شروع کی بات ہے۔ مجھ جیسے نو آموز کے لئے یہ ماحول زندگی کا سرمایہ بنا۔ شاہ جی نے بکمال مہربانی مجھے قرآن کریم ناظرہ پڑھایا۔ (۱) میں بالکل نابلد اور جاہل نوجوان تھا۔ اُن کی فیض صحبت نے میری جیل کی زندگی میں تربیت فرمائی جس کا میں شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں رکھتا۔ اس کے بعد زندگی بھر کے لئے ایک دلی تعلق قائم ہو گیا۔ جب کبھی امرتسر سے باہر دورے پر جاتے تو واپسی پر اپنے دورے کے خاص خاص واقعات مجھے بٹھا کر سناتے جو آج مجھے حفظ ہیں۔ ہم رہا ہوئے تو زمانہ بدل چکا تھا۔ کانگریس کی تحریک کو بند ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ اور ملک کے اندر فرقہ وارانہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ خلافت اور کانگریس تحریک کے مقابلے میں رجعت پرست مسلمان اور ہندو میدان میں اثر کر چکے تھے جن کو کم و بیش حکومت کی معاونت حاصل تھی۔

اہل گجرات نے شاہ جی کا شاندار استقبال کیا۔ اور کوشش کی کہ وہ گجرات شہر میں ہی قیام کریں۔ مگر وہ اپنے امرتسر شہر میں ہی آکر مقیم ہوئے۔ شاہ جی ہندو مسلم اتحاد کے دل سے قائل تھے وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی سیاسی مقصد نہ بھی ہو تو بھی ایک اچھی شہری زندگی کے لئے نیک ہمسایہ کے طور پر ہمیں گزر بسر کرنی چاہیئے۔ وہ ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک پنجاب خلافت کمیٹی کے ہی ممبر رہے اور قومی کاموں کے لئے وہ

۱۔ اسی جیل میں مولانا ظفر علی خان کے چچا راجہ غلام قادر، اختر علی خان اور مشہور پنجابی شاعر عبدالرحیم عاجز نے بھی شاہ جی سے قرآن کریم پڑھا۔ اس کے علاوہ امرتسر میں منشی احمد دین صاحب کی ہمشیرہ اور بیٹی نے بھی شاہ جی کی اہلیہ مرحومہ سے قرآن کریم پڑھا۔ (مدیر)

باہر دورے پر جاتے تھے۔ کیونکہ ان کی مانگ سارے ملک میں ہمیشہ رہتی تھی۔ جس کو وہ بخوبی پوری بھی نہیں کر پاتے تھے۔ شاہ جی مسلمانوں کے اندر رسومات قبیح کے سخت خلاف تھے اور اسی پر اپنی تقریروں میں زور دیتے جو شریعت حقہ کے خلاف تھیں بعض مقامات پر دولت مندوں سے اُن کا جھگڑا بھی ہو جاتا مگر وہ اپنی بات پر پہاڑ کی مانند قائم رہتے۔

خانقاہ ڈوگراں

اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ایک آدمی بالکل غریب مفلوک الحال لاہور ہی میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا اور خانقاہ ڈوگراں چلنے کے لئے شاہ جی کو مجبور کرنے لگا۔ وہ انکار کرتے تھے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ شاہ جی کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ جب شاہ جی تیسرے دن واپس تشریف لائے تو انہوں نے حسب دستور مجھے یہ بتایا کہ:۔

"جب میں اس بستی پہنچا تو وہاں کسی کو معلوم نہ تھا کیونکہ مجھے لے جانے والا آدمی ہی بالکل اکیلا تھا اور بستی غالباً ساری کی ساری راجپوت مسلمانوں کی تھی جن کو مذہبی وعظ وغیرہ سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ میں ایک مسجد میں ٹھہرا۔ اسی آدمی نے خود ہی ٹین بجا کر اعلان وعظ کیا۔ جلسہ کے لئے جو جگہ تجویز کی وہ ایک تکیہ تھا اور اس کے باہر ایک بڑا درخت تھا۔ اس کے نیچے انتظام کیا گیا۔ جب میں جلسہ گاہ میں پہنچا تو وہاں عجیب منظر تھا۔ کوئی پچاس آدمی زیادہ سے زیادہ ہوں گے اور کوئی سو گز کے فاصلہ پر ایک مداری اپنا کھیل وغیرہ دکھا رہا تھا۔ جہاں ڈیڑھ سو آدمی تھے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ کہ کیا کروں؟ یکایک مجھے خیال آیا کہ تو ہزاروں آدمیوں کی حاضری میں خوش ہو کر جذبہ کے ساتھ بولتا ہے مگر یہاں بھی تو خلق خدا ہی ہے۔ اگر اللہ کا پیغام ان چند آدمیوں کو سنائے گا تو کیا تیرا کچھ بگڑ جائے گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میرے جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور میں نے دل میں دعا کی کہ مولا کچھ سامان یہاں بھی کر دے کہ تیرے بندوں میں تیرا پیغام پہنچا سکوں۔ اتنے میں ایک پولیس والا آیا اس نے ایک مداری کو جو دور تماشا دکھا رہا تھا مار بھگایا۔ جو لوگ وہاں تھے وہ اب میری تقریر میں شامل ہو گئے۔ اب حاضری دو سو کے قریب ہو گئی۔ تب میں نے اپنے وعظ کا ڈھنگ بھی بدلا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر گاؤں کے بڑے بڑے زمیندار راجپوت سب کے سب آکر اس وعظ میں شریک ہو گئے۔ تب میں نے تقسیم وراثت پر قرآن حکیم کا فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ اور یہ بھی کہا کہ پنجاب کے زمیندار مسلمان جس میں سید، پٹھان، مغل، راجپوت، جاٹ سب شامل ہیں ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک جتنے بندوبست ہوئے ہیں ان سب نے قرآن سے انکار کر کے ہندو قانون یعنی رواج کو مانا ہے۔ ایسی حالت میں ہم میں سے کون مسلمان ہے اور کون نہیں اس کا فیصلہ تم کسی مفتی شرع سے جا کر کروا لو۔

اس بحث کا شروع ہونا تھا کہ زمیندار طبقہ اٹھا اور آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ:۔

"ایک مولوی ہماری بے عزتی کر رہا ہے" اس پر شاہ جی بھی حالت جنون میں تبدیل ہو گئے اور فرمایا کہ:۔

"قرآن حکیم کے مع مکمل قانون کا انگریز کی عدالت میں کھڑے ہو کر انکار کرنا وہ بھی اس زمین جائیداد کے لئے، جو اسی کی عنایت سے تمہارے پاس ہے۔ اس پر ناراض ہوتے ہو کہ ایک معمولی مولوی ہماری بے عزتی کر رہا ہے۔ تھوڑا سوچ لو میں لاہور سے چل کر آیا ہوں۔ اور ریل کا کرایہ میں نے اپنی جیب سے دیا ہے۔ واپسی کا میری جیب میں ہے۔ تمہاری مسجد کی روٹی میں نے کھائی نہیں پھر تمہارا مجھ پر دباؤ کیسا! رہا زمانہ جہالت کی یاد ذات پات کا سوال تم راجپوت یا جاٹ ہو تو میں سید ہوں۔ پھر بھی تم سے اونچا ہوں۔ ان سب باتوں کو چھوڑ کر جب میں اللہ کا کلام سنانے کے لئے کھڑا ہوا ہوں تو پھر جواب دہی تو اس کے سامنے ہے تمہاری ہستی ہی کیا ہے؟"

تین گھنٹے کی مسلسل تقریر کے بعد شاہ جی کی فتح ہوئی اور یہ طبقہ زمینداران سرنگوں ہوا۔ پھر تو شاہ جی کی حق گوئی اور جادو بیانی نے وہ منظر پیش کیا کہ آخر شاہ جی بھی خوش ہو کر اس بستی سے شام کو لوٹے۔

شاہ جی کی روزانہ زندگی کے واقعات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ اور ہر واقعہ ایک سبق لئے ہوئے ہے۔ قدرت نے ان کو خاص کام کے لئے بھیجا تھا جو انہی کا حصہ تھا۔

☆

شاہ جی کی شخصیت، ان کا جوش عمل، ان کی قربانیاں اور سب سے بڑھ کر ان کی ساحرانہ خطابت، تحریک آزادی وطن، اس کی پرورش اور ترقی کے لئے ایک بڑی مدد اور بیش قیمت اثاثہ تھی۔ ان کی زندگی کے روشن نقوش نہ صرف تاریخ کے صفحات بلکہ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کے دماغوں پر منقش ہو چکے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

آپ اپنی تقریروں کے ذریعے بہت عبادت کر لیتے ہیں **مرشد احرار شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ**

شاہ جی! قدرت نے آپ کو لسان پیدا کیا ہے۔ اس میدان میں آپ کبھی ہیٹے نہیں رہیں گے۔

حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمہ اللہ

مجھے ان کے اخلاق و اخلاص کے علاوہ ان کے کمالات نے بھی عقیدت مند بنا چھوڑا۔ وہ ماہر اسرار کلام اللہ ہیں

مولانا خیر محمد جالندھریؒ